نوٹ

23

نظم کی دیگر اصناف

تعارف

اردو ادب کو موٹے طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک نثری ادب اور دوسرا شعری ادب۔ شعری ادب کو ہم نظم اور غزل کے دو بڑے زمروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اردو شاعری کا جب بھی تذکرہ ہوتا ہے تو عام طور سے اس سے مراد اردو غزل ہوتی ہے۔ بہ قول مسعود حسین رضوی۔

''غزل ہماری شاعری کی وہ صنف ہے جس کی خصوصیتیں ہر نگاہ کو اپنی طرف کھینچتی ہیں' ہر دل میں گھر کرتی ہیں اور ہر محفل کو گرماتی ہیں۔ مقدار کے لحاظ سے بھی غزل کا پلہ بھاری ہے۔ مگر قصیدے مثنویاں، رباعیاں، قطعے اور مسلسل نظمیں بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ بلکہ مجموعی حیثیت سے غزلوں سے کہیں زیادہ ہیں۔''

شعری ادب میں نظم اب ایک علیحدہ صنف کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اور جدید دور میں اس کی مقبولیت میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ نظم کے لغوی معنی ''لڑی میں موتی پرونا'' ہیں۔ نظم کے دوسرے معنی ''ترتیب یا آرائش'' بھی ہیں۔ اردو میں اصطلاح کے طور پر نظم کا لفظ دو مفاہیم میں استعمال ہوتا ہے۔ عام اور وسیع مفہوم میں یہ لفظ نثر کے مدّ مقابل کے طور بولا جاتا ہے اور اس سے مراد پوری شاعری ہوتی ہے اور اس میں وہ تمام اوصاف اور اسالیب شامل ہوتے ہیں جو ہیئت کے اعتبار سے نثر نہیں ہیں۔ مخصوص اور محدود مفہوم میں نظم شاعری کی اس صنف کو کہتے ہیں جس میں کسی خاص موضوع پر مسلسل کلام کے ساتھ اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ نظم میں ایک سے زیادہ موضوعات بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ سب ایک بنیادی موضوع کے تحت یا اس سے مربوط ہوتے ہیں۔ نظم کا ایک مرکزی خیال ہوتا ہے جس کے گرد پوری نظم کا تانا بانا بنا ہوتا ہے۔ ارتقاء بھی نظم کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ طویل نظموں میں یہ ارتقاء واضح ہوتا ہے۔ مختصر نظموں میں یہ اکثر ایک تاثر کی شکل میں ابھرتا ہے۔ نظم کی ان خصوصیات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں غزل کے علاوہ جتنی بھی اصناف شاعری وہ سب نظم میں داخل ہیں لیکن اپنی

نوٹ

چند الگ الگ خصوصیات کی بنا پر کچھ اصناف جیسے قصیدہ مثنوی' مرثیہ' قطعہ وغیرہ کے نام متعین ہو گئے ہیں۔ اس لئے ان اصناف کو نظم نہ کہہ کر انہیں دوسرے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔

اردو کے شعری حصے میں صنف غزل اور صنف نظم پر الگ الگ کتابیں ہیں۔ اس کتاب میں آپ کو نظم کی دوسری اہم اصناف سخن یعنی قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، رباعی اور قطعے سے متعارف کرایا گیا ہے۔

32.1 قصیدہ

قصیدہ ایک ایسی صنف سخن ہے جس کا دامن موضوع کے اعتبار سے بہت وسیع ہے۔ اس میں تعریف اور مذمت کے علاوہ دوسرے موضوعات کا بیان بھی کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً مناظر قدرت، مذہبی خیالات، پند و نصیحت، معاشی بدحالی، سیاسی انتشار وغیرہ۔

قصیدہ کی ابتدا عرب سے ہوئی۔ ایران میں جب شعر و شاعری شروع ہوئی تو شاعروں نے عرب والوں کی تقلید کی۔ قصیدہ ایک صنف سخن ہے جس سے انعام و اکرام وغیرہ حاصل کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے فارسی شاعری نے اس صنف کو انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ اردو میں قصیدے کا فن فارسی شاعری ہی سے لیا گیا ہے۔

عربی زبان میں قصیدے کے معنی ''دل دار'' یا ''گاڑھے گودے'' کے ہیں۔ قصیدہ میں شاعر چونکہ انتہائی ذہنی قوت صرف کرتا ہے، اسی لئے اس کا نام قصیدہ ہو گیا۔ کچھ علماء کا خیال ہے کہ قصیدہ لفظ ''قصد'' سے بنا ہے۔ کیونکہ اس میں شاعر ایک خاص موضوع پر ارادہ کر کے پوری توجہ کے ساتھ شعر کہتا ہے۔ اصطلاح میں ایسی نظم کو قصیدہ کہتے ہیں جس میں کسی کی تعریف یا مذمت (ہجو) کی جائے۔ ابتدا میں اس کا استعمال ذاتی غرض یا کسی لالچ کے لئے نہیں ہوتا تھا، مگر بعد میں انعام و اکرام کے لالچ میں قصیدوں میں بادشاہوں اور نوابوں کی بے جا تعریف کی جانے لگی اور پھر یہی رواج ہو گیا اور قصیدہ کو صرف تعریف یا مذمت کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔

قصیدہ کی بناوٹ یا ہئیت

غزل کی طرح قصیدے کے بھی پہلے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں جو ''مطلع'' کہلاتے ہیں، باقی اشعار کے صرف دوسرے مصرعے ہی ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ قصیدے کے اشعار کی تعداد مقرر نہیں ہے۔ قصیدے میں کبھی کبھی ایک سے زیادہ مطلع بھی ہوتے ہیں۔

قصیدے کی قسمیں

(الف) خطابیہ: جو قصیدہ براہ راست اصل موضوع یعنی مدح یا مذمت سے شروع ہوتا ہے، وہ

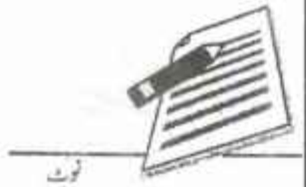

نوٹ

خطابیہ قصیدہ کہلاتا ہے۔

(ب) تمہیدیہ: جو قصیدہ براہ راست مدح یا مذمت سے شروع نہیں ہوتا بلکہ شروع میں کچھ اشعار تمہید کے طور پر شامل کیے جاتے ہیں، وہ تمہیدیہ قصیدہ کہلاتا ہے۔

مضمون کے اعتبار سے قصیدہ کو تین قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) مدحیہ : جس میں کسی کی تعریف کی جائے۔

(۲) ہجویہ : جس میں کسی کی برائی کی جائے یا زمانے کا گلہ شکوہ کیا جائے۔

(۳) وعظیہ : جس میں نصیحت کے مضامین ہوں۔

قصیدے کے اجزائے ترکیبی

۱۔ تشبیب یا نسیب ۲۔ گریز ۳۔ مدح یا مذمت ۴۔ دعا یا حسن طلب

۱۔ تشبیب یا نسیب: عرب کے شعراء قصیدے کی ابتدا ء عشقیہ اشعار سے کیا کرتے تھے، اسی وجہ سے اس حصے کو تشبیب یا نسیب کا نام دیا گیا۔ لیکن اردو میں شعرا نے تشبیب میں حسن و عشق کے علاوہ پند و نصیحت، فلسفہ و حکمت، موسم بہار کی کیفیت وغیرہ کو نظم کر کے اسے وسعت عطا کی۔ اکثر تشبیب کا اصل موضوع یعنی مدح یا مذمت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس میں عام طور سے شاعر کو اپنی علمیت و قابلیت اور قادر الکلامی دکھانے کا پورا موقع ملتا ہے۔ مطلع کے لیے ضروری ہے کہ دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں۔ مطلع کی خوبی یا خرابی قصیدے کے باقی تمام اشعار کا پتہ دیتی ہے، اس لیے شاعر پوری کوشش کرتا ہے کہ مطلع ایسا ہو کہ سننے اور پڑھنے والا چونک پڑے اور اس کی توجہ قصیدے کی طرف مبذول ہو جائے۔ مثلاً سودا کے ایک قصیدے کا مطلع ہے۔

صباح عید ہے اور یہ سخن ہے شہرۂ عام حلال دختر رز بے نکاح و روزہ حرام

۲۔ گریز: تشبیب کے بعد شاعر اصل موضوع یعنی مدح، مذمت پر آنا چاہتا ہے، مگر تشبیب اور اصل موضوع چونکہ دو مختلف چیزیں ہوتی ہیں۔ اس لیے ان دونوں میں تعلق پیدا کرنے کے لیے شاعر ایک یا ایک سے زیادہ شعر کہتا ہے۔ ان اشعار کو "گریز" کہتے ہیں۔ یہ تشبیب اور مدح کے درمیان کڑی کا کام کرتا ہے۔ گریز قصیدے کا سب سے نازک حصہ ہے۔ گریز کے اشعار جتنے خوبصورت اور انوکھے ہوتے ہیں۔ قصیدہ اتنا ہی معیاری مانا جاتا ہے۔

نوٹ

۳۔ مدح یا مذمت: قصیدے کا اصل موضع مدح یا مذمت ہے۔ مدح میں جس کی تعریف کی جاتی ہے اس کا علم و فضل، عدل و انصاف، دلیری اور سخاوت وغیرہ کو بہت بڑھا چڑھا کر مبالغہ آمیز انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ مدح اگر بزرگان دین کی ہوتی ہے تو اشعار میں عقیدت اور احترام جھلکتا ہے، اور اگر قصیدہ انعام کی غرض سے کہا جاتا ہے تو اشعار میں مبالغہ آمیز تعریف و توصیف پائی جاتی ہے۔

۴۔ دعایا حسنِ طلب: یہ قصیدے کا آخری حصہ ہے۔ مدح کے بعد بزرگان دین کے توسط سے خدا سے دعا مانگی جاتی ہے۔ اور اگر قصیدہ کسی شخص کی مدح میں ہے تو حسنِ طلب سے کام لے کر شاعر اپنے لیے انعام کا طالب ہوتا ہے۔ بعض قصیدوں میں صرف ممدوح کی صحت اور درازی عمر وغیرہ کی دعا مانگ کر قصیدہ ختم کر دیا جاتا ہے۔

23.2 قصیدے کا ارتقاء

دکن میں جب اردو شاعری کا آغاز ہوا تو قصیدہ نگاری کی طرف بھی خاص توجہ کی گئی، کیوں کہ اس زمانے میں اردو شاعری سے دلچسپی لینے والے لوگ عام طور پر صوفیائے کرام تھے۔ اس لیے ایسے قصیدے زیادہ کہے گئے جن میں خدا اور بزرگان دین کی مدح کی جاتی تھی۔

محمد قلی قطب شاہ غالباً پہلا شاعر ہے جس نے قصیدہ نگاری کا باقاعدہ آغاز کیا۔ اس نے حمد، نعت، منقبت وغیرہ کے ساتھ ساتھ مذہبی تہواروں اور موسموں پر بھی نظمیں کہیں جو قصیدے ہی کی ایک شکل ہیں۔

سوداؔ کے زمانے تک اردو میں اچھے خاصے قصیدے کہے جا چکے تھے۔ لیکن سوداؔ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے قصیدہ نگاری کو باقاعدہ فن کی حیثیت سے انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ اگر انہیں اس فن کا امام کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ انہوں نے حمد، نعت اور منقبت بھی کہے اور بادشاہوں اور امیروں کی مدح بھی کی۔ قصیدے کا انداز بیان دوسرے اصناف سخن سے مختلف ہوتا ہے، مضمون آفرینی، جوش بیان، پُر شکوہ الفاظ، روانی، سلاست اور جدت وغیرہ قصیدے کی خصوصیات ہیں۔ سوداؔ کے قصیدوں میں یہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ اسی زمانے میں میر تقی میرؔ اور قائمؔ چاند پوری وغیرہ نے بھی قصیدے کہے۔ لیکن سوداؔ کے سامنے ان کا چراغ نہ جل سکا۔

اردو قصیدہ نگاری میں سوداؔ کے بعد انشاؔ کا نام آتا ہے۔ انشاؔ نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں قصیدے کہے ہیں۔ ان کے قصیدوں میں مضمون آفرینی اور بلند پروازی، جوش و خروش اور زور بیان تو ضرور ہے لیکن فارسی اور عربی کے مشکل الفاظ کے استعمال کی وجہ سے سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔

ماڈیول- 4
نظم کی دیگر اصناف

نوٹ

مصحفی انشاء کے ہم عصر ہیں۔ انہوں نے بھی عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں قصیدے کہے ہیں۔ ان کے قصیدوں میں وہ شان وشوکت اور بلند پروازی ملتی ہے جو قصیدے کے لیے ضروری ہے لیکن وہ جوش وخروش نہیں ہے جو سودا اور انشاء کے قصدوں میں پایا جاتا ہے۔

سودا کے بعد اردو کے سب سے بڑے قصیدہ نگار شیخ محمد ابراہیم ذوق ہیں۔ انہیں بہادر شاہ ظفر کی استادی کا شرف بھی حاصل تھا، اس لیے ان کے تمام قصیدے اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہیں۔ بہ قول مولانا محمد حسین آزاد، ذوق نے قصیدے کو ایسی اونچی محراب پر سجایا ہے کہ یہاں تک کسی کا ہاتھ نہیں پہنچتا۔'' ذوق کے قصیدوں میں جو رنگین بیانی، شکوہ الفاظ، زور بیان اور استادانہ فن کاری ہے، وہ ان کے بعد کسی اور شاعر کو نصیب نہ ہو سکی۔

ذوق کے ہم عصروں میں غالب اور مومن نے چند اچھے قصیدے کہے۔ مومن کے قصیدے زیادہ تر بزرگان دین کی مدح میں ہیں۔ غالب کے اردو میں چار قصیدے ملتے ہیں، جن میں دو حضرت علی کی مدح میں ہیں اور دو بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہیں اور علمیت اور فن شعر میں مہارت کے ضامن ہیں۔

مومن اور غالب کے بعد قصیدہ نگاری میں ایک اہم نام محسن کاکوری کا ہے جنہوں نے بہت سے قصیدے کہے۔ ان کا ایک قصیدہ ۔ ''سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل'' بہت مقبول ہوا۔ محسن کاکوروی کے علاوہ داغ دہلوی، منیر شکوہ آبادی، امیر مینائی، جلال لکھنوی، عزیز لکھنوی اور جلیل مانک پوری وغیرہ نے بھی چند قصیدے کہے مگر انہیں کوئی خاص شہرت حاصل نہ ہو سکی۔ آج نہ بادشاہ ہیں اور نہ ان کا دربار، اور نہ ہی انعام واکرام کی بارش کرنے والے اور فن کی قدر کرنے والے قدر دان، ایسی حالت میں اگر قصیدے کو زوال نہ آتا تو تعجب کی بات تھی۔ آج اس صنف کو گھن لگ گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج بھی ذاتی مفاد سے اوپر اُٹھ کر کام کرنے والوں کی عزت اور حوصلہ افزائی صرف اسی صنف کے ذریعے ممکن ہے۔

23.3 مرثیہ

مرثیہ لفظ ''رثا'' سے بنا ہے جس کے معنی ہیں رونا، ماتم کرنا۔ اصلاً مرثیہ سے مراد وہ نظم ہوتی ہے، جو کسی شخص کے مرنے پر لکھی جائے اور جس میں مرنے والے کی خوبیاں بیان کی جائیں اور اپنے غم کا اظہار کیا جائے۔ لیکن اردو میں مرثیے کا ایک خاص مفہوم متعین ہو گیا ہے۔ یعنی مرثیے سے مراد وہ نظم ہے، جس میں حضرت امام حسینؓ اور دیگر کربلا کے شہیدوں کا ذکر کیا جائے۔ اس کے علاوہ باقی تمام لوگوں کی موت پر کہی جانے والی نظموں کو شخصی مرثیے کا نام دیا جاتا ہے۔ مثلاً حالی نے غالب کے مرنے پر مرثیہ غالب لکھا اور اقبال نے داغ کا مرثیہ لکھا۔ چکبست نے کو کھلے کا مرثیہ لکھا۔

ابتداء میں مرثیے مختصر لکھے جاتے تھے اور ان کے لیے کوئی خاص شکل بھی مقرر نہیں تھی۔ کہا جاتا ہے کہ سودا پہلے شاعر ہیں

نوٹ

جنھوں نے مرثیے کے لیے مسدس کی ہیئت استعمال کی۔ میر خلیق اور میر ضمیر کے زمانے میں مسدس کو مقبولیت حاصل ہوئی اور پھر مرثیے کے لیے صرف یہی ہیئت مخصوص ہوگئی۔ میر ضمیر نے مرثیے کے اجزائے ترکیبی متعین کیے جو حسب ذیل ہیں۔

۱۔ چہرہ : چہرہ، مرثیے کی تمہید کو کہتے ہیں۔ اس میں شاعر ایسے مضامین نظم کرتا ہے جن کا اصلی موضوع سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جیسے صبح کا منظر، رات کا سماں، گرمی کی شدت، دنیا کی بے ثباتی، سفر کے مصائب، اپنی شاعری کی تعریف، حمد، نعت، منقبت وغیرہ۔

۲۔ سراپا: اس میں مرثیے کے ہیرو کے قدوقامت، خدوخال اور دیگر اوصاف کا بیان کیا جاتا ہے۔

۳۔ رخصت: اس حصے میں ہیرو کو میدان جنگ میں جانے کے لیے حضرت امام حسینؓ سے اجازت لیتے ہوئے اور تمام عزیزوں سے رخصت ہوتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔

۴۔ آمد: اس حصے میں ہیرو کے گھوڑے پر سوار ہوکر شان وشوکت کے ساتھ میدان جنگ میں آنے کی منظر کشی کی جاتی ہے۔ اس میں گھوڑے کی مبالغہ آمیز تعریف بھی نظم کی جاتی ہے۔

۵۔ رَجز: ہیرو اپنے خاندان کی تعریف، اپنے بزرگوں کے کارناموں کا ذکر اور جنگ کے معاملات میں اپنی مہارت اور بہادری کا بیان کرتا ہے۔ دشمن کی فوج کے جس پہلوان سے مقابلہ ہوتا ہے، وہ بھی اپنے اسلاف کی بہادری کا بیان کرتا ہے۔

۶۔ جنگ: ہیرو مقابل فوج کے کسی نامور پہلوان سے یا پوری فوج سے بڑی شجاعت اور بہادری کے ساتھ لڑتا ہے۔ جنگ کے ضمن میں ہیرو کی تلوار اور گھوڑے کی تعریف بھی کی جاتی ہے۔

۷۔ شہادت: ہیرو میدان جنگ میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے آخر کار دشمنوں کے ہاتھ سے زخمی ہوکر شہید ہوجاتا ہے۔ مرثیے کے اس جز میں اسی شہادت کا بیان انتہائی موثر انداز میں کیا جاتا ہے۔

۸۔ بین: یہ مرثیے کا آخری جزو ہوتا ہے۔ کچھ لوگ اسے علیحدہ جز وشمار نہیں کرتے بلکہ شہادت ہی میں شامل کرتے ہیں۔ اس آخری حصے میں اس منظر کی تصویر کشی کی جاتی ہے، جب ہیرو کی لاش پر اس کے عزیز واقارب خاص طور پر عورتیں اس کی خوبیوں کا بیان کرکے روتی ہیں۔ انیس کو اس صفت میں کمال حاصل ہوتا ہے۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اردو میں بہت کم ایسے مرثیے ہوں گے جن میں تمام اجزائے ترکیبی ملتے ہیں۔ ایسے مرثیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں صرف حضرت امام حسینؓ کی شہادت پر اظہار غم کیا گیا ہے۔

اردو مرثیے کا آغاز دکن میں پندرھویں صدی کے نصف آخر میں ہوا۔ ابتدائی مرثیے عام طور پر پانچ سات شعروں سے زیادہ کے نہیں ہوتے تھے۔ محمد قلی قطب شاہ، ملا وجہی کے یہاں اس قسم کے مرثیے ملتے ہیں۔ شمالی ہند میں میر اور سودا سے قبل مرثیہ

ماڈیول- 4
نظم کی دیگر اصناف

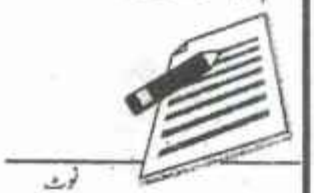

نوٹ

کہنے والوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی۔ سوداؔ اور میرؔ دونوں کے کلیات میں مرثیوں کی اچھی تعداد ہے۔ ان دونوں کے بعد بھی دہلی میں شاعروں نے مرثیے لکھے لیکن ان میں کوئی قابل ذکر شاعر نہیں ہے۔

لکھنؤ میں میر خلیقؔ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے صرف مرثیہ گوئی میں کمال حاصل کیا۔ خلیقؔ نے غزل گوئی سے شاعری کی ابتدا کی تھی لیکن بعد میں تمام توجہ صرف مرثیہ گوئی پر مرکوز کردی۔ ان کے مرثیوں کی زبان صاف پاکیزہ ہے۔ اسی لیے ان کے مرثیوں میں سوز و گداز اور درد واثر ہے۔ خلیقؔ کے ہم عصروں میں میر ضمیرؔ بھی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مرثیے کے بہت سے اجزائے ترکیبی کی ایجاد اور ان کی ترتیب میر ضمیرؔ ہی نے کی۔

میر ببر علی انیسؔ کو شاعری ورثے میں ملی تھی۔ انیسؔ نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی لیکن بہت جلد غزل چھوڑ کر مرثیہ کہنے لگے۔ انیسؔ کی سب سے بڑی خوبی ان کی قادرالکلامی ہے۔ واقعہ نگاری میں میر انیسؔ کو پوری قدرت حاصل ہے۔ زبان وبیان کے معاملے میں انیسؔ کا مقابلہ کوئی اور مرثیہ گو نہیں کرسکتا۔ ان کے کلام میں جو سلاست، روانی، فصاحت، بلاغت اور شگفتگی ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔

میر انیسؔ کے ہم عصر اور حریف مرزا دبیر ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی تشبیہات اور استعارات کا برجستہ استعمال ہے۔ دبیرؔ اپنے مرثیوں میں پُرشکوہ الفاظ، شاعرانہ استدلال اور مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ انیسؔ اور دبیرؔ نے مرثیہ گوئی کو ایک اعلا فن کا درجہ دیا، اسے استحکام بخشا اور اجزائے مرثیہ کو بڑی خوبی کے ساتھ نبھایا۔ انیسؔ اور دبیرؔ کے بعد بھی مرثیے لکھے گئے لیکن کوئی اس فن کو ان دونوں سے آگے نہ لے جاسکا۔

حقیقت یہ ہے کہ مرثیوں کی ترقی سے اردو شاعری میں رزمیہ شاعری (جنگ سے متعلق شاعری) کی جو کمی محسوس ہوتی تھی وہ پوری ہوگئی بلکہ منظر نگاری، جذبات نگاری اور دیگر اخلاقی مضامین سے اردو شاعری اور نکھر گئی۔

23.4 مثنوی

مثنوی کے لغوی معنی ہیں ''دوہرا کیا ہوا'' یا ''دو دو والا''۔ اصطلاح میں ان مسلسل اشعار کے مجموعے کو مثنوی کہتے ہیں جس میں ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ لیکن ہر شعر میں الگ الگ قافیہ لایا جاتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ ہیئت کے اعتبار سے مثنوی کا ہر شعر اپنی جگہ ایک مطلع ہوتا ہے۔ مثنوی کے اشعار کی تعداد مقرر نہیں ہے۔

اردو میں طویل اور مختصر دونوں طرح کی مثنویاں لکھی گئی ہیں۔ طویل مثنویوں کی مثالیں میر حسنؔ کی ''سحرالبیان'' اور دیا شنکر نسیمؔ کی ''گلزار نسیم'' ہیں۔ اور مختصر مثنویوں میں میر تقی میرؔ کی مثنویوں کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ طویل مثنویوں میں عام طور پر مندرجہ ذیل اجزا، پائے جاتے ہیں۔

نوٹ

1. حمد ومناجات
2. نعت
3. منقبت
4. حاکم وقت کی مدح
5. اپنی شاعری کی تعریف
6. مثنوی لکھنے کا سبب
7. قصہ یا واقعہ
8. خاتمہ

لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر مثنوی میں یہ تمام اجزا موجود ہوں۔

فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں مثنوی ایک اہم صنف سخن ہے۔ اس میں جن اور پریوں کے قصے اور مافوق الفطرت واقعات سے لے کر عام انسانوں کے حسن وعشق کے قصے، خوشیوں اور غموں، جنگ، بزم طرب، شادی اور موت کی رسموں، اخلاقی قصوں، تصوف کے مسائل اور مذہبی تعلیمات کا بیان کیا جاتا ہے۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ کسی زمانے کے سیاسی، سماجی حالات، رسم ورواج، رہن سہن کے طریقے، لباس اور زیورات وغیرہ کی تفصیلات جاننے کے لیے مثنوی کا مطالعہ سب سے زیادہ مفید ہے۔

دکنی اردو میں آغاز ہی سے مثنویاں ملنا شروع ہوجاتی ہیں۔ میراں جی شمس العشاق نے ''شہادت الحقیقت'' اور ''خوش نامہ'' لکھیں۔ نظامی نے ''کدم راؤ پدم راؤ'' مثنوی لکھی۔ یہ مثنوی ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے۔ سید اشرف بیابانی نے ایک مثنوی ''نوسرہار'' لکھی۔ مقیمی کی مثنوی ''چندر بدن'' اور غواصی کی مثنوی ''سیف الملوک'' کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ ملا وجہی کی مثنوی ''قطب مشتری'' بھی دکن کی مشہور مثنوی ہے جس میں محمد علی قطب شاہ اور ایک رقاصہ بھاگ متی کے عشق کی داستان نظم کی گئی ہے۔ ابن نشاطی کی مثنوی ''پھول بن'' کو بھی بڑی شہرت ملی۔ سراج کی مثنوی ''بوستاں خیال'' اک اہم مثنوی ہے۔

شمالی ہند میں اردو شاعری کے آغاز ہی سے اچھی مثنویوں کے نمونے ملنے لگتے ہیں۔ شاہ مبارک آبروؔ کی ''وعظ آرائش معشوق'' اور حیدر بخش حیدری کی ''شاہ نامہ'' شمالی ہند کی ابتدائی مثنویاں ہیں۔ اسی زمانے میں سوداؔ اور میرؔ کی مثنویاں بہت اہم ہیں۔ ان دونوں نے مثنوی کو ہجو اور مدح دونوں کے لیے استعمال کیا ہے۔

خواجہ میر دردؔ کے چھوٹے بھائی میر اثرؔ دہلوی کی مثنوی ''خواب وخیال'' اسی زمانے میں لکھی گئی۔ اس مثنوی کا کوئی پلاٹ نہیں۔ ایک معمولی سی حسن وعشق کی داستان بیان کی گئی ہے لیکن اس میں جو سراپا بیان کیا گیا ہے، وہ بہت خوبصورت ہے۔ اس مثنوی کی سب سے اہم خوبی میر اثرؔ کا انداز بیان ہے۔ زبان میں سادگی، روانی اور شگفتگی ہے۔ شمالی ہند کی یہ پہلی کامیاب مثنوی ہے۔

ماڈیول- 4
نظم کی دیگر اصناف

نوٹ

مثنوی خواب وخیال دہلی میں لکھی گئی تھی لیکن ہر لحاظ سے سب سے زیادہ کامیاب مثنوی لکھنؤ میں لکھی گئی جس کا نام ''سحرالبیان'' ہے اور اسے میر حسن نے لکھا ہے۔ اس مثنوی کی اصل اہمیت یہ ہے کہ اردو میں پہلی بار کسی شاعر نے ہندوستانی تہذیب وتمدن، رہن سہن آداب واطوار، زیور اور لباس وغیرہ کا اتنا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ پوری مثنوی میں جو سلاست، روانی، شگفتگی اور برجستگی ہے وہ اس سے پہلے کسی مثنوی میں نہیں ملتی۔

اردو کی ایک عظیم مثنوی ''گلزار نسیم'' ہے۔ جسے دیا شنکر نسیم نے لکھا ہے۔ نسیم نے اس مثنوی میں جو زبان استعمال کی ہے اس میں لفظی تکلفات، الفاظ کا تناسب، تشبیہیں اور استعارے اور رعایت لفظی کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ مثنوی ''سحرالبیان'' دلّی کی اور ''گلزار نسیم'' لکھنؤ کی نمائندہ مثنویاں ہیں۔

اسی زمانے میں نواب مرزا شوق نے بھی چھ مثنویاں لکھیں۔ لیکن مثنوی ''بہار عشق'' اور مثنوی بسنے والے گوشت پوست کے انسان ہیں۔ مرزا نواب شوق کو میر اثر کی مثنوی ''خواب وخیال'' بہت پسند تھی۔ اس لیے ان کی مثنوی پر ''خواب وخیال'' کا اثر صاف نظر آتا ہے۔

مولانا حالی اور مولانا محمد حسین آزاد کے زمانے سے مثنوی کے اسلوب اور موضوعات میں نمایاں فرق آیا، اور اس میں عوامی موضوعات اور مسائل نظم کیے جانے لگے۔ حالی کی مثنوی ''برکھارت'' اور ''مچھ کی داد'' کو بہت شہرت ملی۔ مولانا محمد حسین آزاد، اسمٰعیل میرٹھی، اور شوق قدوائی نے بھی کئی مثنویاں لکھیں۔

جوش نے ''جنگل کی شہزادی'' تخلیق کر کے شہرت حاصل کی۔ ان کی مثنوی ''بیوہ سہاگن'' بھی نہایت پُرتاثیر ہے۔
اردو شاعری کے آغاز سے لے کر 1857 تک بہت کم شعرا ایسے ہوں گے جنھوں نے مثنویاں نہ کہی ہوں لیکن شہرت انہیں مثنویوں کو ملی جن کا ذکر اوپر آیا ہے۔

23.5 ''رباعی''

غزل، قصیدے اور مثنوی کی طرح رباعی کا نام بھی عربی سے نکلا ہے۔ یہ لفظ ''رُبع'' سے بنا ہے جس کے معنی ''چار'' کے ہیں۔ اس اعتبار سے رباعی چار مصرعوں والی نظم کو کہتے ہیں۔ رباعی کو دوبیتی اور ترانہ بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن ہر چار مصرعے والی نظم کو رباعی نہیں کہتے۔ رباعی ایک خاص بحر اور مخصوص وزن کے تحت لکھی جانے والی چار مصرعوں کی نظم ہوتی ہے۔ اس بحر کا نام ''ہزج'' ہے۔

رباعی کے لیے یہ لازمی ہے کہ اس کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہو۔ کبھی کبھی تیسرا مصرع بھی ہم قافیہ ہوتا ہے۔ قطعے کے پہلے دو مصرعوں کا ہم قافیہ ہونا ضروری نہیں۔ مضمون کے اعتبار سے چاروں مصرعوں سے بات کا مطلب واضح ہوتا ہے۔

نوٹ

رباعی کا آخری مصرعہ خاص طور سے بہت زوردار ہوتا ہے۔ یہ پوری رباعی کا نچوڑ اور نقطۂ عروج ہوتا ہے۔

معنی کے اعتبار سے رباعی میں حسن و عشق، اخلاق، فلسفہ، تصوف، مذہب، پند و نصیحت اور شاعر کے ذاتی حالات کا بیان ہوتا ہے۔ رباعی میں الفاظ کے انتخاب اور اسلوب بیان میں متانت اور موزونیت کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

اردو شاعری میں رباعی کی روایت زمانۂ قدیم سے چلی آ رہی ہے۔ شمالی ہند میں بیشتر شاعروں نے کچھ نہ کچھ رباعیاں ضرور کہی ہیں۔ مشالی ہند کے مشہور شاعروں میں مرزا محمد رفیع سوداؔ نے تقریباً تمام مضامین باندھے ہیں۔ ان کی ایک مدحیہ رباعی دیکھیے جس میں چوتھے مصرعے کے مبالغے نے رباعی کو لافانی کر دیا ہے۔

ایوانِ عدالت میں تمہارے اے شاہ
کیا ظلم کو ہے دخل عیاذاً باللہ
شیشے کا جو واں طاق سے رپٹے ہے پاؤ
پتھر سے نکلتی ہے صدا بسم اللہ

خواجہ میر دردؔ کو رباعی کہنے پر پوری قدرت تھی۔ انہوں نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں رباعیاں کہی ہیں۔ میر تقی میرؔ بھی کامیاب رباعی نگار ہیں۔ غزل میں ان کا جو انداز بیان ہے، وہ یہاں بھی قائم ہے۔ اسی لیے ان کی رباعی میں بھی حزن و یاس اور سوز و گداز ہے۔ انہوں نے رباعی میں بہت سے مضامین باندھے ہیں۔ یہاں ان کی ایک رباعی پیش کی جاتی ہے۔

تیمور نے اک مورچہ زیر دیوار
دیکھا کہ چڑھا دانے کو لے کر سو بار
آخر سر بام لے کے پہنچا تو کہا
مشکل نہیں پیش ہمت دشوار

قائم چاند پوری، مرزا جعفری علی حسرتؔ، احسن اللہ خان بیانؔ وغیرہ کے کلام میں بھی رباعیاں ملتی ہیں۔ اس کے بعد کے شعرا میں مصحفی قابلِ ذکر رباعی گو ہیں۔ اس کے بعد انیسؔ اور دبیرؔ کے زمانے تک بیشتر شاعروں نے رباعیاں کہیں۔ مگر ان میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔

میر انیسؔ کی رباعیاں میں تمام مضامین ملتے ہیں۔ انہوں نے مذہبی موضوعات پر بہت زیادہ رباعیاں کہیں۔ چونکہ بنیادی اعتبار سے وہ مرثیہ گو تھے اس لیے انہوں نے واقعات کربلا پر رباعیاں بھی کہی ہیں۔ ایک رباعی ملاحظہ فرمائیے۔

جب دفن ہوا شیر خدا کا خانی
سجاد نے کی قبر پر آب افشانی

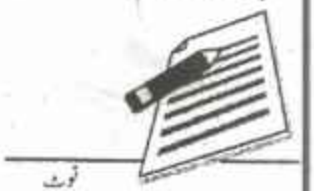

نوٹ

شبیر کی پیاس کا کہوں میں کیا اثر
پیتی گئی خاک جتنا چھڑکا پانی

۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد جب تمام ہندوستان پر انگریزوں کا پورا قبضہ ہوگیا تو ہندوستانیوں کے سامنے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ مغربی تعلیم حاصل کریں۔ اس سیاسی انقلاب اور مغربی علوم کی وجہ سے ادیبوں اور شاعروں میں نیا شعور پیدا ہوا اور رباعی میں ایسے مضامین کہے جانے لگے جو اس سے پہلے کبھی نہیں کہے گئے تھے۔ ایسے شاعروں میں مولانا الطاف حسین حالؔی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حالؔی نے جہاں اخلاقی، فلسفیانہ رباعیاں کہیں، وہاں اصلاحی اور سیاسی رباعیاں کہہ کر قوم کو سدھارنے کی کوشش بھی کی۔ مثلاً

اے علم! کیا تو نے ملکوں کو نہال
غائب ہوا تو جہاں سے واں آیا زوال
اُن پر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح
جن قوموں نے ٹھہرایا تجھے راس المال

جوش ملیح آبادی دراصل نظم کے شاعر ہیں۔ لیکن انہیں رباعی گوئی میں بھی پوری مہارت حاصل ہے۔

فراقؔ گورکھپوری نے اردو میں اعلا درجے کی رباعیوں کا اضافہ کیا ہے۔ انہوں نے رباعیوں میں اپنے محبوب کے سراپا بیان کیے ہیں اور ہندوستانی زندگی کا عکس اُتارا ہے۔ اگر کہا جائے کہ فراقؔ نے اردو رباعی کو نئی زبان دی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے ہندی الفاظ کا اتنی کثرت سے استعمال کیا ہے، اور پھر ان الفاظ کے استعمال میں پورے سلیقے سے کام لیا ہے۔ ان کی ایک رباعی پیش ہے۔

غنچے کو نسیم گدگدائے جیسے
مطرب کو ساز چھیڑ جائے جیسے
یوں پھوٹ رہی ہے مسکراہٹ کی کرن
مندر میں چراغ جھلملائے جیسے

23.6 قطعہ

غزل کے دو یا دو سے زائد ایسے اشعار جن میں کوئی مضمون یا خیال تسلسل کے ساتھ پیش کیا گیا ہو 'قطعہ' کہا جاتا تھا۔ غزل گو شاعر اگر اپنے خیال کو ایک شعر میں مکمل نہیں کر پاتا تھا تو ایک سے زیادہ اشعار میں خیال ادا کر کے اسے قطعہ بند کر دیتا تھا، اور اس کے لیے "ق" کی علامت لگا دی جاتی تھی۔ لیکن جدید شاعری میں دو اشعار یا چار مصرعوں کے قطع کو ایک علیحدہ صنف

نوٹ

کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ قطعہ میں دو سے زیادہ اشعار بھی ہو سکتے ہیں۔ قطعہ سے ہماری مراد وہ صنف سخن ہے، جس میں شاعر دو یا دو سے زیادہ اشعار کو خیال اور مضمون کے اعتبار سے تسلسل کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ قطعہ اور غزل میں بنیادی فرق یہ ہے کہ قطعہ کے تمام اشعار معنوی اعتبار سے ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں، جب کہ غزل کے ہر شعر کی ایک آزاد اور جداگانہ حیثیت ہوتی ہے۔

قطعہ کی اہمیت

رباعی کی طرح قطعہ بھی دو اشعار یا چار مصرعوں کا ہوتا ہے۔ رباعی میں پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے، جب کہ قطعے میں دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہونا ضروری ہے۔ یعنی عام طور سے قطعے میں مطلع نہیں ہوتا۔ رباعی کی ایک بحر مخصوص ہے جب کہ قطعہ کسی بھی بحر میں کہا جا سکتا ہے۔

اختر انصاری نے اپنے قطعات کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کی۔ معنی اور مضمون کے اعتبار سے ان کے قطعات اعلا درجے کے ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں

''ہم قطعہ کے ذریعے ایک مختصر نظم کو سمیٹ کر چھوٹا بنا دیتے ہیں۔''

قطعہ گو شاعر چار مصرعوں میں ایک مکمل خیال کو پوری شدت اور تاثیر کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی بھی اپنے قطعات کے لیے مشہور ہیں۔ دور حاضر میں شعرا، نئے نئے مضامین کو قطعات میں پیش کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر وسیم بریلوی کا ایک مشہور قطعہ ہے ۔

ٹوٹی ہوئی قبروں پہ بال بکھرائے
جب کوئی ماہ جبیں روتی ہے
میں یہ اکثر خیال کرتا ہوں
موت کتنی حسین ہوتی ہے

آپ نے کیا سیکھا

- اردو کے شعری ادب کو نظم اور غزل کے دو بڑے زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔
- اردو میں غزل کے علاوہ جتنی بھی دوسری اصناف شاعری ہیں مثلاً قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی اور قطعہ وغیرہ سب نظم ہی میں داخل ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنی چند خصوصیات کی بنا پر ان کے یہ نام متعین ہو گئے ہیں۔

نوٹ

نظم کی دیگر اصناف

- قصیدے کی ابتدا عرب سے ہوئی۔ عربی شاعری سے یہ صنف فارسی شاعری میں داخل ہوئی اور اردو میں یہ فن، فارسی شاعری سے لایا گیا۔
- مضمون آفرینی، جوش بیانی، شکوہ الفاظ، روانی اور جدت قصیدہ کی خصوصیات ہیں۔
- قصیدے کے دو بڑے شاعر محمد رفیع سوداؔ اور محمد ابراہیم ذوقؔ ہیں۔
- مرثیہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں حضرت امام حسینؓ اور دیگر شہدائے کربلا کا ذکر کیا جائے اور ان کی شہادت پر بین اور ماتم کا بیان کیا جائے۔
- اس کے علاوہ باقی تمام لوگوں کی موت پر کہی جانے والی نظموں کو شخصی مرثیہ کا نام دیا جاتا ہے۔
- مرثیے کے اجزائے ترکیبی مندرجہ ذیل ہیں۔

  چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت، بَین۔
- مرثیے کے فنکو میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے مرتبۂ کمال تک پہنچایا۔
- مرثیے کا خاص مقصد رونا، رُلانا اور رونے کی ترغیب دینا ہے۔
- مثنوی میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو نثری داستانوں میں ملتی ہیں۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ اور مولانا محمد حسین آزادؔ کے زمانے میں مثنوی کے موضوعات میں بہت وسعت آ گئی۔
- کسی زمانے کے سیاسی، سماجی، حالات، رسم و رواج، رہن سہن کے طریقے اور لباس و زیورات اور تیج تہوار وغیرہ کی تفصیلات جاننے کے لیے مثنوی کے مطالعے کی بڑی اہمیت ہے۔
- اردو کی دو مشہور مثنویوں کے نام ''سحر البیان'' اور ''گلزار نسیم'' ہیں۔
- مثنوی کے دو مشہور شعرا میر حسنؔ اور دیا شنکر نسیمؔ ہیں۔
- رباعی چار مصرعوں والی نظم کو کہتے ہیں۔ رباعی کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے۔
- رباعی کے مشہور شعرا مولانا الطاف حسین حالیؔ، جگت موہن لال رواںؔ، جوشؔ ملیح آبادی اور فراقؔ گورکھپوری ہیں۔
- امجدؔ حیدر آبادی اردو کے واحد شاعر ہیں جن کی تمام تر شہرت رباعی گوئی کی بدولت ہے۔
- رباعی کی طرح قطعہ بھی دو اشعار یا چار مصرعوں کی نظم ہوتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ رباعی میں پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے، جب کہ قطعے میں دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہونا ضروری ہے۔
- قطعہ گو شاعر چار مصرعوں میں ایک مکمل خیال کو پوری شدت اور تاثیر کے ساتھ پیش کرتا ہے۔
- اختر انصاری نے اپنے قطعات کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کی۔

نوٹ

اختتامی سوالات 23.9

مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب اپنی کاپی میں لکھیے۔

1. اردو کے شعری ادب میں نظم اور غزل کے علاوہ دوسری اصناف سخن کیا ہیں؟ ان کے نام لکھیے۔
2. قصیدے کے انداز بیان کی خصوصیات لکھیے اور دو مشہور قصیدہ گو شعراء کے نام لکھیے۔
3. مرثیہ کسے کہتے ہیں؟ دو مشہور مرثیہ نگاروں کے نام لکھیے۔
4. مرثیے کے اجزائے ترکیبی لکھیے۔
5. مثنوی کی خصوصیات کیا ہیں؟ مثنوی پڑھنے کے کیا فائدے ہیں؟
6. اردو کی دو مشہور مثنویوں اور ان کے
9. چار مشہور رباعی گو شعراء کے نام لکھیے۔
10. دو مشہور قطعہ گو شعراء کے نام لکھیے۔